رسائل و مسائل

نظامِ طاغوت اور سرمایہ دارانہ نظام کا فرق

سوال: طاغوتی نظام کی جو اصطلاح آپ کے لٹریچر میں استعمال کی جاتی ہے، اس میں سرمایہ دارانہ نظامِ صنعت و تجارت بھی شامل ہے یا نہیں؟ نیز آپ جس طرح طاغوت کے قائم کردہ نظامِ حکومت و سیاست کی نوکریوں کو ناجائز ٹھیراتے ہیں کیا اسی طرح سرمایہ دارانہ اصولوں پر قائم ہونے والی فرموں اور کمپنیوں کی نوکری کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں یا نہیں؟ — مثلاً سنگر سیونگ مشین کمپنی یا ٹاٹا سٹیل فرم یا ٹاٹا شو کمپنی وغیرہ۔ ان نظاموں میں فرق کیا ہے؟

جواب: طاغوتی نظام سے ہماری مراد وہ نظامِ حکومت ہے جو حکمِ غیر اللہ کو خدا کی زمین پر جاری کرنے کے لیے قائم ہو۔ ایسے نظام کے قیام میں مددگار ہونا حرام ہے۔ رہا سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت تو وہ طاغوتی نظام کی تعریف میں نہیں آتا بلکہ اسے فاسقانہ نظام کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اُس کی منظم معصیت اور اس کے حرام طریقوں نے انسانی معیشت کو انتہا سے زیادہ گندہ کر دیا ہے لیکن بہرحال اس کی خدمت کا گناہ طاغوتی نظام کی خدمت کے گناہ سے کم تر ہے — اس لیے کہ یہ فاسقانہ نظام طاغوتی نظام ہی کے بل پر قائم ہے اور خرابیوں کی اصل جڑ طاغوتی نظام ہے۔ اگر ایک شخص ان دونوں نظاموں کی خدمت کے سوا کوئی تیسرا ذریعۂ معاش پا سکتا ہو تو اس کے لیے اس تیسرے ذریعے کا اختیار کر لینا لازم ہے، لیکن اگر کسی کے سامنے صرف ان دو میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا سوال درپیش ہو تو پھر اھون البلیتین یہی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے کسی ادارے میں نوکری کر لے، بشرطیکہ اسے براہِ راست کسی حرام فعل کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، مثلاً

سود کی تحصیل یا اس کا حساب کتاب :

نظام باطل کو ٹیکس دینے اور اسکی ملازمت کرنے میں فرق

سوال :- طاغوتی نظام کے اندر رہتے ہوئے ایک شخص اس کی ملازمت پر مجبور ہو جاتا ہے اور ایک دوسرا شخص تجارت کرتے ہوئے ٹیکس ادا کرنے کی مجبوری میں مبتلا ہوتا ہے۔ کیا ان دونوں مجبوریوں میں کوئی فرق ہے ؟ درانحالیکہ نظام طاغوت کو دونوں سے یکساں تقویت پہنچتی ہے۔ پھر کیا جس طرح ملازمت پر مجبور ہو جانے والے کو ملازمت سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے، اسی طرح کیا ٹیکس دینے والے تاجر کو ٹیکس دہندگی سے بچنے کے لیے اپنی تجارت کو کم نہیں کرنا چاہیے ؟

جواب :- طاغوتی نظام کی اضطراری ملازمت ہو یا اسے ٹیکس دینا ہو، دونوں مجبوریوں میں محض مجبور ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں، البتہ اس پہلو سے فرق ضرور ہے کہ ایک مجبوری یعنی ملازمت سے آدمی کوشش کرے تو نکل سکتا ہے، مگر دوسری مجبوری سے اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک یہ نظام بدل نہ جائے۔

اگر کوئی شخص جائز طریقوں سے تجارت کرتا ہے اور اس سے اس کے منافع میں ترقی ہوتی ہے تو اس کا صرف اس لیے تجارت کو گھٹانے اور گرانے کی کوشش کرنا کہ موجودہ طاغوتی نظام کو ٹیکس نہ دینا پڑے، صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس طرح وہ ٹیکس سے بچنے کے ساتھ اپنی اس مالی طاقت کو بھی کم کرنے کا موجب ہوگا جس سے وہ موجودہ نظام کو صالح نظام سے بدلنے کی کوشش کر سکتا ہے ـــــ مگر یہ حکم صرف اس شخص کے لیے ہے جو واقعی صالح نظام کے قیام میں اپنی مالی قوت کو صرف کر رہا ہو اور اس کی معاشی جدوجہد محض اپنے عیش کو بڑھانے کے لیے نہ ہو۔

دونوں مجبوریوں میں ایک فرق اس لحاظ سے بھی ہے کہ ملازم تو نظام باطل کے قیام و نفاذ اور استحکام و ارتقاء میں براہ راست حصہ لے رہا ہے، لیکن ٹیکس دینے والا تاجر اس قیام میں حصہ

لینے نہیں جا رہا ہے بلکہ جو کوشش وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھنے اور نظام اسلامی کو تقویت دینے کے لیے کر رہا ہے، اس میں سے نظام باطل بالجبر ایک حصہ لے اڑتا ہے۔

ہندو مسلم فسادات میں ہماری پالیسی

سوال: ۔ جماعت کی طرف سے بہار ریلیف ورک کا جو آغاز ہو رہا ہے، وہ محض انسانی ہمدردی اور اعانت مظلوم کے جذبہ کے تحت ہونا چاہیے، اور اس سلسلہ میں جو فیصلہ بھی کیا جائے اور جو قدم بھی اٹھے اس میں ہمارے پیش نظر "مسلمان قوم" کی خدمت نہ ہو، بلکہ ایسے کاموں کا جب بھی موقع پیش آئے تو انھیں ہندو مسلم کے امتیاز کے بغیر سرانجام دیا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نواکھالی میں ہندو عنصر پر جو زیادتیاں کی گئی ہیں، ان کے پیش نظر نواکھالی میں تو ہم نے ریلیف کا کام شروع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن جب بہار کے مسلمانوں پر ظلم ڈھایا گیا تو ہم معاً مسلمان مظلومین کی امداد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ــــ آخر اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس امتیاز کا محرک مسلم قوم پرستی کا کوئی دبا چھپا اثر تو نہیں؟ اگر ایسا ہے تو یہ چیز بہت خطرناک مفسدات رکھتی ہے، اور اس سے نہ صرف یہ کہ غیر مسلم عناصر کو ہماری اصل حقیقت کے سمجھنے میں غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں گی، بلکہ خود جماعت کے اندر جہاں کہیں مسلم نیشنلزم کے کچھ بچے کھچے اثرات موجود ہوں گے، رفتہ رفتہ ابھرنے لگیں گے، اور ہماری جماعت ایک بین الانسانی جماعت ہونے کی جگہ مسلمانوں کی ایک قومی جماعت ہو کے رہ جائے گی۔

ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ بہار کے امدادی کام کے سلسلہ میں عموماً "مسلمان مظلومین" کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، حالانکہ ہمارا منصب محض "مظلومین" کی امداد کرنا ہے، چاہے وہ ہندو مظلومین ہوں یا مسلمان مظلومین! پھر کیا وجہ ہے کہ خاص طور پر "مسلمان مظلومین" کے الفاظ استعمال کیے جائیں؟

جواب: - ہماری جماعت جس دعوت کو لے کر کھڑی ہوئی ہے اس کا خطاب ساری انسانیت سے ہے اور اس دعوت کی فطرت سے جو اخلاق مناسبت رکھتا ہے وہ قوم پرستانہ اخلاق نہیں، بلکہ انسانی اور اسلامی اخلاق ہے۔ ان دونوں امور کو کسی موقع پر نظر انداز نہیں کیا گیا اور آئندہ بھی ہم انھیں کبھی نظر انداز نہ کریں گے۔

فسادات کے معاملہ میں ہم اپنی محدود طاقتوں کے ساتھ چار قسم کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ایک تو فساد کی علت العلل کو ختم کرنے کی سعی۔ دوسرے کسی مقام پر فساد کے پھوٹ پڑنے کو روکنا۔ تیسرے فساد پھوٹ پڑے تو اس کا مقابلہ کرنا۔ اور چوتھے کسی فساد زدہ رقبہ کے مظلومین کی حتی المقدور امداد کرنا۔ ان چاروں قسم کے فرائض کی ادائی میں کسی قسم کے قومی تعصب کو کوئی دخل نہیں ہے

جہاں تک فسادات کی علت العلل یعنی خدا کی ہدایت سے بے نیازی کا ازالہ کرنے کا تعلق ہے ہم مسلمان، ہندو اور دوسری ساری قوموں کو اپنا پیغام پہنچانے میں یکساں سرگرم ہیں۔ یہ بات البتہ ہمارے اختیارات سے باہر ہے کہ جس آسانی سے مسلمانوں کے حلقہ میں ہمارا پیغام سنا اور سمجھا جاتا ہے اس آسانی سے غیر مسلموں میں سنا اور سمجھا نہیں جاتا! تاہم ہماری دعوتی مساعی کسی امتیاز قومی کی روادار نہیں ہیں! بالکل اسی طرح کسی مقام پر اگر ہمارے اراکین موجود ہوں تو وہاں فساد کو پھوٹ پڑنے سے روکنے کے لیے جو پالیسی جماعت نے طے کی ہے وہ بھی مسلم اور غیر مسلم کی تمیز سے پاک ہے۔ ایسے موقعوں پر ہمارے کارکن جس طرح مسلمان عوام کو اسلامی اخلاق کے نام سے اپیل کرتے ہیں، اسی طرح غیر مسلم عوام کو بھی عام انسانی اخلاق کے نام سے اپیل کر کے فساد سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پھر جہاں تک ان کا بس چلتا ہے، دونوں ہی طرف کے سرخیل لوگوں سے مل کر فضا کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اگر ان کوششوں کے باوجود فساد پھوٹ پڑے تو جماعت نے ارکان کو جو پالیسی طے کر کے دی ہے وہ یہ ہے کہ ظالم چاہے ہندو ہو یا مسلمان اس کا مقابلہ جان لڑا کر کیا جائے اور مظلوم چاہے ہندو ہو یا مسلمان، اسے ظالموں سے بچانے کی پوری کوشش کی جائے۔ نیز پناہ مانگنے والے کو پناہ دی جائے، چاہے وہ کسی قوم کا فرد ہو! خود کوئی پیش دستی کسی

پڑ نہ کی جائے لیکن اپنے مال، جان اور آبرو کے بچاؤ میں کوئی بزدلی نہ دکھانی چاہیے۔ پھر جس جگہ فساد کی قیامت لوگوں کے سر سے گذر گئی ہو، وہاں اگر ہمارا کوئی رکن موجود ہو تو اس کا یہ فرض ہے کہ اپنی بساط کے مطابق وہ ستم رسیدہ عناصر کی خدمت اور ہمدردی پر کار بند ہو جائے!

ان مختلف مواقع کے فرائض میں کسی قومی امتیاز اور کسی قومی تعصب کے اثر انداز ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن یہ فرائض انھیں مقامات اور علاقوں میں انجام دیے جا سکتے ہیں جہاں ہمارے کچھ کارکن موجود ہوں۔ مقامی کارکن اپنے کام میں اگر بیرونی امداد کے محتاج ہوں اور جماعت کسی طرح کی بھی کوئی امداد انھیں فراہم کر سکتی ہو تو انھیں بیرونی امداد بھی بہم پہنچائی جائے گی، لیکن یہ یاد رہے کہ کسی علاقہ میں کوئی کام مقامی کارکنوں کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نواکھالی میں کچھ نہ کر سکے۔ نواکھالی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں ہماری آواز بالکل نہیں پہنچی ہے۔ نہ وہاں کوئی رکن جماعت ہے، نہ کوئی ہمدرد اور نہ ہماری دعوت سے کسی کے کان آشنا ہیں۔ پھر وہاں اردو زبان بھی نہیں سمجھی جاتی اور ہمارا کوئی کارکن ایسا نہیں ہے جو اس علاقے میں جا کر کام کر سکتا ہو۔ اگر ہم بطور تکلف ادھر ادھر سے چند کارکن وہاں بھیج دیتے تو ان کا جانا درحقیقت بالکل بے کار ہوتا ـــ ہمیں محض نمائش اور اشتہار بازی تو کرنی نہ تھی کہ چند آدمیوں کو وہاں بھیج کر ملک میں ڈھنڈورہ پیٹ دیتے کہ دیکھیے ہم نے نواکھالی میں کام کیا ہے!

نہ صرف یہ کہ خود نواکھالی میں ہمارا کوئی رکن یا ہماری کوئی مقامی جماعت نہیں ہے، بلکہ بنگال بھر میں جماعت کی کوئی ایک مضبوط شاخ بھی موجود نہیں اور نہ منفرد ارکین کی کوئی بڑی تعداد ہی پائی جاتی ہے، جسے جمع کر کے کوئی کام کیا جا سکتا۔ اس وجہ سے نواکھالی کے معاملہ میں ہمیں مجبوراً صبر کرنا پڑا۔ بخلاف اس کے، بہار میں ہماری جماعت کا خاص اثر موجود تھا، خود شہر پٹنہ میں مقامی جماعت موجود تھی اور صوبہ کے بعض دوسرے شہروں میں بھی مقامی جماعتیں بن چکی تھیں۔ نیز منفرد ارکان اور ہمدردوں کا بھی ایک اچھا خاصا حلقہ صوبہ میں پھیلا ہوا تھا۔

پس ان مقامی کارکنوں کی مجموعی طاقت کو ذریعۂ کار بنا لیا گیا اور ان کو جس حد تک ہم باہر سے مدد دے سکتے تھے، دی جا رہی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ ہمارے مظلومین کے لیے "مسلمان مظلومین" کے الفاظ کیوں استعمال کیے جاتے ہیں، سو اس کے جواب میں اول تو یہ واضح رہے کہ جماعت کے کسی سرکاری مراسلہ یا مجلس شوریٰ کے کسی فیصلہ میں تو یہ چیز نہیں پائی جاتی، ہاں عام طور پر ذاتی خطوط یا شخصی گفتگوؤں میں ایسا کہا جاتا ہوگا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اگر کسی جگہ فی الواقع مسلمان ہی مظلوم ہوں تو انھیں "مسلمان مظلومین" کہنے میں کونسا گناہ ہے؟ واقعہ کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کر دینے کے بجائے کسی معاملہ میں ایک بناوٹی طرز کلام اختیار کرنا اور اس پر خواہ مخواہ کی احتیاطی پابندیاں لگانا ان لوگوں کا کام ہے جن کے دل میں "چور" ہوتا ہے۔ ہم جب اپنے اصول میں مخلص ہیں تو ہمیں ہندو کو ہندو اور مسلمان کو مسلمان کہنے میں کیا باک ہے؟ آخر ہم کوئی متحدہ قومیت تو پیدا کرنے نہیں اٹھے ہیں کہ ہندو اور مسلمان کے الفاظ استعمال کیے جائیں تو یہ متحدہ قومیت ڈھ جائے گی!

اسی سلسلہ میں ایک بات اور بھی ملحوظ رکھیے، اور وہ یہ ہے کہ اصول و مقصد کا بین الانسانی ہونا اور ہماری دعوت کا غیر قومی ہونا ہمیں یہ ہرگز نہیں سکھاتا ہے کہ مسلمان قوم سے ہمیں کلی مقاطعہ کرنا چاہیے۔ آخر جس قوم کے درمیان ہم پیدا ہوئے اور پلے ہیں اور جس کے ساتھ ہمارا رہن سہن ہے، اس سے ہمارا تعلق فطری تعلق ہے اور اس فطری تعلق کا اگر ہم تکلفاً انکار بھی کریں تب بھی یہ واقعۃً موجود ہے اور موجود ہی نہیں بلکہ اس کی وجہ سے ہم پر بعض ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں! یہ گویا ہمارا ایک مشترک کنبہ ہے اور اس کنبے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا ہمارا ایک فطری فرض ہے۔ اس کنبے پر اگر کوئی مصیبت کا دور آئے گا تو ہمیں بہرحال اس کے دوسرے افراد کے ساتھ مل کر اس کا بچاؤ کرنا ہوگا، ہمیں اسے منظم رکھنا ہوگا، اور ہمیں ان کے ساتھ ان ساری حفاظتی سرگرمیوں میں شریک رہنا ہوگا جو ہمارے اصول اخلاق کی حدود کو نہ پھاندتی ہوں اور اگر وہ ان

حدود کو پھاندتی ہوں تو ہمارا کام یہ بھی ہے کہ ہم انھیں پابند حدود بنا دیں۔

البتہ عام طور پر نیشنلزم دنیا بھر میں اور خود ہندوستان میں، بلکہ مسلمانوں میں پھیلا ہوا ہے اس کے اثر سے بہرحال ہمارے سینے پاک ہیں۔ نیشنلزم جو اصول پیش کرتا ہے وہ ہمارے اصول کی عین ضد ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ تمھاری قوم اگر بھلائی کرے تو بھی اور برائی کرے تو بھی تم اس کا ساتھ دو، مگر ہمارا اصول یہ کہتا ہے کہ تمھاری قوم اگر بھلائی کرے تو تم اس کا ساتھ دو اور برائی کرے تو نہ صرف یہ کہ اس کا ساتھ نہ دو، بلکہ یہ بھی لازم ہے کہ برائی سے اس کا ہاتھ روکنے کی کوشش کرو۔ یہی ہم کرنا چاہتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ لیکن ہم اس غیر فطری اصول پسندی کو صحیح نہیں سمجھتے جس کا تقاضا یہ ہو کہ اپنی قوم کی مصیبتوں پر ہم الگ بیٹھے تماشا دیکھتے رہیں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ موقع پاکر کوئی وعظ کہہ دیں۔

خصوصیت سے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہی گروہ ہماری دعوت کا اولین مخاطب ہے۔ اس کا ذہن آسانی سے ہماری بات سن سمجھ سکتا ہے اور دوسروں کے قریب آنے سے پہلے یہی ہمارے قریب آسکتا ہے اور یہی سب سے زیادہ سچا ہی تحریک حق کے لیے فراہم کرنے والا ہے پس اس گروہ سے ہمارا جو قریبی تعلق ہے، کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کا زبان سے انکار کریں یا عملی رویہ تجویز کرنے میں اسے نظر انداز کر دیں۔ یا اس کی وجہ سے جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں ان کو پورا کرنے سے گریز کریں۔

نماز اور اذان اردو زبان میں

سوال :۔ نبی صلعم چونکہ عربی تھے اور اہل عرب کی طرف آپ کی بعثت بالخصوص تھی، اس وجہ سے یہ امر تو بالکل فطری تھا کہ خدا کی ہدایت عربی زبان میں نازل ہو اور پہلے اہل عرب کو متاثر کیا جائے اور بعد میں وہ دوسری زبانوں کے ذریعے دعوت حق کو دوسری قوموں تک پہنچائیں۔ لیکن نماز کی زبان کا ساری دنیا کے لیے عربی مقرر ہو جانا سمجھ میں نہیں

کس بنا پر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غیر زبان میں جو نماز پڑھی جاتی ہے اس میں نہ تو مطالب کلمات سہولت سے پیش نظر رہ سکتے، نہ نمازی کا تاثر گہرا ہو سکتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ عجمی زبانوں میں نماز پڑھنے کی ممانعت نہ ہونے کے باوجود، عربی زبان میں نماز پڑھنے کی عادات امت نے اختیار کر رکھی ہے۔ پھر نماز ہی نہیں، جمعہ کا خطبہ تک عربی زبان میں دیا جانا ضروری ہو گیا ہے حالانکہ اس سے عوام کی تعلیم و تذکیر کا جو کام لیا جانا مقصود ہے، وہ اس پابندی کی وجہ سے انجام نہیں پاتا۔ علیٰ ہذا القیاس اذان کا معاملہ بھی ہے۔ مجھے بتایا جائے کہ آخر اذان اگر اردو میں کہی جائے تو اس میں کیا چیز مانع ہے؟

جواب: - جہاں تک نماز کا تعلق ہے اس کے معاملہ میں تو شروع سے آج تک تمام امت کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ نماز انھیں الفاظ میں ہونی چاہیے جن کی نبی صلعم نے تعلیم فرمائی ہے اور ویسے بھی نماز کا سب سے اہم جز تلاوت قرآن ہے اور قرآن کا اطلاق اس کے ترجمہ پر نہیں ہو سکتا بلکہ صرف انھیں الفاظ پر ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں۔ رہی اذان تو اس کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے اور کوئی صاف حکم اس بات کا موجود نہیں ہے کہ اذان عربی زبان ہی میں ہو۔ لیکن ہر قوم کی زبان میں اذان الگ الگ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں بھی وہی (Nationalization of church) یعنی مذہب کو قومی بنا دینے کی بیماری پیدا ہو جائے۔ جو لوتھر کی تحریک کی وجہ سے یورپ میں پیدا ہوئی۔ اور جس کی وجہ سے ایک مذہب ہونے کے باوجود یورپ کی قومیں ایک دوسرے سے پھٹ کر باہم دشمن بنتی چلی گئیں۔

اگر اردو زبان میں کوئی شخص اذان دے رہا ہو تو خود ہندوستان ہی کے باشندوں میں بہت سے آدمی ایسے ہوں گے جو اس کو سن کر یہ نہ سمجھ سکیں گے کہ اذان ہو رہی ہے۔ مثلاً بنگالی مالا باری وغیرہ۔ یہ چیز پیروان اسلام کو جمع کرنے والی نہیں بلکہ پھاڑ دینے والی ہے۔ اسی بنا پر خطبہ جمعہ میں بھی ہماری رائے یہ ہے کہ افہام و تفہیم کے لیے اگر اس کا ایک حصہ قومی زبان میں ہو تو اس کے ساتھ ہی ایک حصہ لازماً عربی زبان میں بھی ہونا چاہیے تاکہ جمعہ کا خطبہ اور نتیجۃً خود نماز جمعہ

کی وہ مقدار حاصل ہو سکتی ہے جو اتنی مالیت کی چاندی یا اتنی مالیت کے سونے سے حاصل ہونی چاہیے تھی۔ علاوہ بریں اسے اپنے نوٹوں اور سکوں کے عوض ہر وقت مارکیٹ سے بھی اور سکے اور نوٹ جاری کرنے والی حکومت کے خزانہ سے بھی مقررہ مالیت کا سونا چاندی مل سکتا ہے۔ سکہ اور نوٹ تو حکومت کی طرف سے اس بات کی رسید یا سند ہے کہ اس کا مالک اتنی مالیت کے سونے چاندی کا مالک ہے اور حکومت ہر وقت اس مالیت کا سونا چاندی دینے پر تیار ہے، اور حکومت ملک بھر کے لیے یہ لازم ٹھیراتی ہے کہ وہ اس سکے اور نوٹ کے بدلے میں وہ سب کچھ ادا کرے جو اس کی قوت خرید (Purchasing Value) کی رو سے منڈی کے نرخوں پر ادا ہونا چاہیے۔

اب آپ نوٹ اور روپے کو بالکل چاندی سونے کی طرح چاندی سونے کی جگہ ہر کام میں استعمال کرتے ہیں، اجرتیں اسی سے لیتے و دیتے ہیں، خرید و فروخت اسی سے کرتے ہیں، قیمتوں کا اندازہ اسی سے باندھتے ہیں، اور ان سارے کاموں میں آپ نوٹ کو کاغذ کا ایک پرزہ اور سکے کو دھات کی ایک ٹکلی مان کر اور اسی لحاظ سے اس کی قیمت مقرر کر کے معاملہ نہیں کرتے، بلکہ نوٹوں اور سکوں کو بالکل چاندی سونے کی حیثیت سے لیتے دیتے ہیں، لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ جب اللہ کا حق ہی ادا کرنے کا موقع آئے تو آپ یہ عذر فراد کریں کہ یہ نوٹ تو کاغذ کے پرزے ہیں اور یہ سکے تو اونی دھاتوں کے ٹکڑے ہیں، ان پر اللہ میاں زکوٰۃ کیسے لگانے لگے، اُن کا حق تو صرف سونے چاندی کے ذخائر پر عائد ہوتا ہے!

نوٹوں اور سکوں کا مالک دراصل چاندی اور سونے ہی کا مالک ہوتا ہے، اور حکومت کے ایک انتظام کے تحت وہ چاندی سونا اٹھائے پھرنے سے بچ کر سونے چاندی کی ملکیت کی سندوں اور رسیدوں کے ذریعے سارے کام چلاتا ہے، اس کے "نقدین" حکومت کے پاس جمع رہتے ہیں اور وہ ان کے ہم قدر "مصنوعی نقدی" حکومت سے حاصل کر لیتا ہے اور یہ مصنوعی نقدی "نقدین" کی سو فیصدی قائم مقامی کرتی ہے۔ اس وجہ سے اس مصنوعی نقدی یعنی نوٹوں اور سکوں پر شریعت بھی نقدین کا حکم لگائے گی اور ان میں سے اللہ کا حق طلب کرے گی۔

(۲) رہا دوسرا سوال سو ہندوستان میں چونکہ معیار زر چاندی کو مقرر کیا گیا ہے اور تمام سکوں

اور نوٹوں کی قیمت یا ان کی قوت خرید چاندی ہی کے معیار پر مقرر کی جاتی ہے اور ان کے بدلے میں حکومت چاندی ہی ادا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اس لیے ہندوستان میں نوٹوں اور سکوں کی زکوٰۃ نکالنے کے لیے چاندی ہی کا نصاب ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ہاں جن مغربی ممالک میں "معیارِ زر" طلا ہے ان میں نوٹوں اور سکوں کی زکوٰۃ سونے کے نصاب سے محسوب ہوگی۔

کیا نظامِ طاغوت اطاعت کا مستحق ہے؟

سوال:۔ (۱) اگر یہ درست ہے کہ "خدا بادشاہِ زمین و آسمان ہے، وہ زمین پر کسی اور کی بادشاہی کس طرح تسلیم کر سکتا ہے" تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے "جالوت" کو کیوں حکمرانی عطا کی (واللہ یؤتی ملکہ من یشاء)۔ اور فرعون کو کیوں مصر ایسا زرخیز ملک عطا کیا جیسا کہ فرعون کہتا ہے کہ الیس لی ملک مصر؟

اگر یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے احکام کی اطاعت کا مطالبہ کرنے کے بعد اپنے بندوں کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ ان حاکموں کی اطاعت بھی کی جائے جو اس کی سند کے بغیر حکومت جماتے ہیں اور اس کے حکموں کے خلاف حکم دیتے ہیں تو پھر یہ واضح ہونا چاہیے کہ وہ ایسے حاکموں کو اس کا موقع ہی خود کیوں دیتا ہے کہ غلط حکومتیں قائم کریں؟ یہ صورت تو وہی ہوئی کہ

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ‌ای   باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

خود ہی "بے سندوں" کو حکومت سے نوازنا اور پھر بے بس رعایا سے یہ مطالبہ کرنا کہ ان کی اطاعت نہ کرو دونوں متضاد باتیں ہیں۔ میری رائے میں تو تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء سے بڑا سرٹیفکٹ ان کی اطاعت کو لازم کرنے والا اور کیا ہو سکتا ہے! یہ بات بھی اسی رائے پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون کو فرعون سے خطاب کرتے ہوئے آدابِ شہنشاہی کی پابندی کرنے کا حکم قولا لہ قولا لینا کے الفاظ میں دیا گیا تھا — کہ خبردار

بے ادبی نہ ہونے پائے۔

مزید یہ کہ فرمانروایانِ وقت کی اطاعت کا نظریہ بغاوت اور فساد کا موجب ہوتا ہے حالانکہ واللہ لایحب الفساد اور لاتفسدوا فی الارض کی رو سے مسلمان کے لیے امن پسند رہنا لازمی ہے۔

جواب: (۱) یہ سوال نتیجہ ہے خدا کی مشیت اور اس کی رضا کے فرق کو نہ سمجھنے کا۔ آپ تو فرعون اور جالوت کی بادشاہی پر غور کر رہے ہیں، اصل جڑ کو لیجیے کہ خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا اور جب شیطان کو خود ہی پیدا کیا اور اسے اختیار دیا تھا کہ وہ انسانوں کے قلوب پر اپنا اثر ڈالے اور نفوس کے اندر نفوذ کرے تو پھر غریب انسان سے یہ مطالبہ کیوں کیا کہ وہ شیطان کا اثر قبول نہ کرے؟ ۔ اور اب جب کہ اس نے شیطان کو پیدا کیا ہے اور انسان پر اثر ڈالنے کا اسے موقع دے دیا ہے تو پھر آدمی کو بھی یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ شیطان کا احترام اور اس کی اطاعت کرے۔ مگر یہ گتھی قرآن نے بہت اچھی طرح سلجھا دی ہے۔ آپ اگر قرآنی فلسفہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان خیر اور شر کے دو گونہ محرکات کے درمیان ایک محدود اختیار کے ساتھ مقامِ آزمائش میں کھڑا ہے۔ وہ خدا کی اطاعت بھی کر سکتا ہے اور اس سے انحراف کر کے فرعون اور جالوت کے آگے بھی سرِ تسلیم خم کر سکتا ہے، اور چاہے تو خود فرعون اور جالوت بن سکتا ہے، اور اس کا امتحان اس میں ہے کہ وہ کونسا رویہ اختیار کرتا ہے؟ وہ جو حق و عدل کا رویہ ہے یا وہ جو ظلم و باطل کا رویہ ہے؟ جس اسی پر جزا و سزا کا دار و مدار ہے۔

خدا کی مشیت نے دونوں راستے کھلے رکھے ہیں۔ وھدیناہ النجدین۔ انسان جس راستے پر بھی چلے گا خدا کی مشیت ہی کے تحت چلے گا۔ مگر خدا کی رضا یہ نہیں ہے کہ وہ بغاوت اور معصیت کی راہ پر چلے۔ اس کی رضا یہی ہے کہ وہ اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جو اس نے اپنی شریعت سے بنا دی ہے۔ اگر خدا کی مشیت نے بالجبر انسان کو شر اور فساد کے راستہ سے روک کر خیر اور صلاح کے راستہ پر چلایا ہوتا اور نہ شیطان کا وجود ہوتا، نہ بدی کے محرکات ہوتے، نہ غلطی کے امکانات، تو پھر انسان کا اپنا کارنامہ کیا ہوتا، خود اس نے کونسی جد و جہد دکھائی ہوتی، خود اس نے کہاں عقل لڑائی ہوتی، اس نے

بدی کی طاقتوں کے خلاف کونسی قوت صرف کی ہوتی اور نیکی کی حمایت میں کونسی قربانیاں کی ہوتیں کہ وہ کسی جزا کا مستحق ہوتا اور اس میں اور درختوں اور پتھروں میں کونسا فرق باقی رہ جاتا ؟ اختیار کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ انسان انبیاء کی پیروی کرنے پر بھی اور شیاطین کے پیچھے چلنے پر بھی قادر ہو، وہ خدا کی بندگی و اطاعت میں یکسو بھی ہو سکے اور خدا سے روگردانی کرکے فراعنہ اور نمارده کی غلامی اور پرستش بھی کرسکے، وہ اپنی قوت سے برائی کو بھی غذا دے سکتا ہو اور بھلائی کی آبیاری بھی کرسکتا ہو، وہ اپنی زندگی کی پونجی رضائے الٰہی کی خریداری میں بھی صرف کرسکے اور اسے خواہشوں کے قمارخانے میں بھی اڑا سکے ـــ پھر اس اختیار اور آزادی کو پا کے وہ اپنے ارادہ کے ساتھ جس طرز کی زندگی کو اپنے لیے پسند کرے اس کے مطابق اسے جزا و سزا ملنی چاہیے۔

یہ عجیب طرح کی رائے ہے کہ حکومت باطل کا اتباع بھی ویسا ہی جائز بلکہ لازم قرار دیا جائے جیسا حکومت حق کا اتباع ہونا چاہیے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ خیر و شر میں سرے سے کوئی وجہ امتیاز باقی ہی نہ رہی۔ فرعون کی حکومت اور موسیٰ علیہ السلام کا نظام اسلامی، نبی صلعم کی مدنی ریاست اور قیصر و کسریٰ کی بادشاہتیں، چونکہ سب اللہ ہی کی مشیت سے وجود میں آئی تھیں لہٰذا ان میں سے جس کی بھی اطاعت کی گئی، اللہ کو کوئی شکایت نہیں اور جس کے خلاف بھی بغاوت اٹھائی گئی، اللہ کے ہاں ایسی بغاوت پر عتاب ہوگا کیا بہتر نہ ہوگا کہ اس فلسفہ کو اور زیادہ پھیلایا جائے اور فارمولا یہ بن جائے کہ انسان شیطان کا اتباع کرے یا انبیاء کا، اعلیٰ اخلاق کی پابندی کرے یا سفلی خواہشات کی، حق پسند ہو یا باطل پرست، اسلام پر کاربند ہو یا کفر پر، بات ایک ہی ہے۔

آپ کی غلط فہمی یہ ہے کہ آپ نے مہلت اور ڈھیل کو اجازت اور اباحت کا ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ یعنی یہ کہ چونکہ فرعون اور جالوت کو اس امر کا موقع خود اللہ ہی نے دیا تھا کہ وہ بادشاہت جمائیں اور لوگوں سے اپنی اطاعت کرائیں، اس وجہ سے از خود انہیں اس کی طرف سے آئینی اجازت بھی اس کی حاصل ہے ورنہ چاہیے یہ تھا کہ جہاں کسی کا قدم حدود بندگی سے آگے بڑھتا اور خدا کی رضا کے خلاف قانون سازی کی جاتی تو فوراً فرشتے آکر اس کو جکڑ لیتے اور اٹھا کر جہنم میں ڈال دیتے۔ حالانکہ عالم انسانی کا نظام ڈھیل کے جس قانون پر چل رہا ہے وہ اباحت کا ہم معنی نہیں۔ مراد یہ کہ یہاں ایک چور کو چوری کی مہلت حاصل ہے

قاتل کو قتل کی قوت میسر ہو جاتی ہے، شرابی کو شراب پینے کے مواقع ملتے ہیں، زانی کو زنا کی گنجائش ہاتھ آتی ہے اور کفار کو نظام کفر کو استوار کر لینے کی قوت مل جاتی ہے، لیکن یہ سب کچھ ڈھیل قانون کے تحت ہے، اس کے معنی یہ نہیں کہ چوری کرنا، قتل کرنا، زنا کرنا یا کافرانہ حکومتوں کو بنانا اور چلانا اور ان کی اطاعت کرنا قانون الٰہی اور حکومت الٰہی کی نگاہ میں جائز و مباح ہیں۔ خدا نے ہر گناہ کے لیے ڈھیل ضرور دی ہے مگر اجازت کسی گناہ کی نہیں دی، اجازت صرف نیکی کرنے کی دی گئی ہے۔ اس ڈھیل کا صحیح استعمال یہ ہے کہ اسے صرف جائز امور میں صرف کیا جائے اور ناجائز امور سے پرہیز کیا جائے، ورنہ جب یہ ڈھیل ختم ہو جائے گی تو انسان کو اپنے عمل کی فطری جزا و سزا کا خیر مقدم کرنا ہوگا اور جس نے خدا کے قانون حرمت و اباحت کو نظر انداز کر کے ڈھیل اور مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہوگا وہ عذاب الٰہی میں پکڑ لیا جائے گا۔ زندگی کی کھیتی جو اللہ نے انسان کے سپرد کی ہے، کانٹے بھی اگا سکتی ہے اور پھول بھی، انگور بھی اس میں بوئے جا سکتے ہیں اور دھتوڑ بھی، خیر کی تخم ریزی کرو تو بھی یہ اسے قبول کرتی ہے اور شر کے بیج ڈالو تو بھی یہ انھیں لینے سے انکار نہیں کرتی مگر اس کے اصل مالک نے انسان کے لیے لازم یہی ٹھیرایا ہے کہ وہ صرف خیر کی کاشت کرے اور شر کی فصل اس کھیتی میں نہ بوئے ــــ ورنہ جو کچھ بویا جائے گا وہ کاٹنا بھی ہوگا۔

قولاً لیناً کے معنی آداب شہنشاہی کو برقرار رکھنے کے نہیں لیے جا سکتے۔ معلوم نہیں یہ غلط فہمی آپ کو کس وجہ سے ہوئی ہے۔ "لینۃ" خشونۃ کی ضد ہے اور اس کے معنی نرمی اختیار کرنے کے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو ان الفاظ کے ساتھ جو ہدایت دی گئی تھی وہ در اصل اسلام کی حکمت تبلیغ کا ایک مستقل اصول ہے، یعنی مبلغ کو نرمی اور حسن کلام سے بات کرنی چاہیے، اور مخاطب کو جذبات نفرت و تشدد کے مظاہرہ سے اشتعال دلا کر فرار عن الحق پر آمادہ نہ کر دینا چاہیے، ورنہ کیا کسی مومن کے دل میں یہ تصور بھی سما سکتا ہے کہ فراعنہ اور نماردہ کے درباروں میں رکوع و سجود اور حمد و ثنا کرنے اور عاجزی اور سرافگندگی اور تذلل کی نمائش کرنے اور "حضور والا جاہ" "بندہ پرور" ــــ "خداوند ولی نعمت" جیسے الفاظ سے بات کرنے کے جو شرک آمیز آداب مروج ہیں ان کی پابندی

کے لیے خود خدا اپنے اخص الخواص بندوں کو حکم دے۔ خود قرآن ہی میں دیکھیے کہ اس "قولاً لینا" پر عمل کرتے ہوئے خدا کے پیغمبر نے دربار فرعون میں کیا کہا اور کیسے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے کہنے کی بات یوں متعین فرما دی تھی کہ فقولا انا رسولا ربک فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبھم قد جئناک بایۃ من ربک والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔ پھر جس کے بعد ان کو فرعون وعدہ کا دن ٹھیرا کر جب پھر گیا تو حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ ویلکم لا تفتروا علی اللہ کذبا فیسحتکم بعذاب وقد خاب من افتریٰ۔ یہ باتیں بالکل سیدھی سادی ہیں اور ان میں "حضور" اور "جناب" کے الفاظ کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور ان میں "عبدیت" کی کوئی اسپرٹ نہیں پائی جاتی، بلکہ بات کا انداز بالکل ویسا ہے، جیسے سیدھے سیدھے معاملات میں سیدھی سیدھی گفتگو کی جاتی ہے۔ ذرا اور آگے اسی سورہ طٰہٰ میں ملاحظہ ہو کہ موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لانے والے درباری مداری کس طرح یکایک باغیانہ اور بے باکانہ جذبات اسلام سے مالا مال ہو جاتے ہیں۔ فرعون انھیں قید اور سولی اور قطع اعضا کی سزاؤں سے ڈراتا ہے لیکن وہ پورے نافرمان بن کر کہتے ہیں لن نؤثرک علیٰ ما جاءنا من البینت والذی فطرنا فاقض ما انت قاض ما انما تقضی ھذہ الحیوۃ الدنیا۔ — کیا آدابِ شہنشاہی کو برقرار رکھنے کے لچھن یہی ہوتے ہیں کہ فرعون کے حکم کو ٹھکرانے کا صاف صاف اظہار کر دیا جائے۔ یہ تو ایک نبی پر ایمان لانے والے مومنوں کا مقام ہے، پھر کیا نبی کا مقام آپ اس سے بھی پست کرنا چاہتے ہیں؟

باطل کا اقتدار اور طاغوت کا تسلط مٹانے کے لیے جو جنگ لڑی جاتی ہے اس کا نام قرآن نے جہاد رکھا ہے اور اسے سب سے بڑی عبادت قرار دیا ہے۔ اسے فساد فی الارض سے تعبیر کرنا اسلامی نظریہ صلاح و فساد سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اسلام کے نزدیک فساد صرف اس حالت کا نام ہے جس میں انسان اپنے خدا کی ہدایت سے ہٹ گیا ہو اور افساد یہ ہے کہ خدا کے بندوں کو خدا کی ہدایت پر چلنے سے روکا جائے اور غیر اللہ کے آئین کی پابندی پر مجبور کیا جائے، چاہے بظاہر ہر طرف سکون ہی سکون ہو اور کوئی معرکۂ جنگ کہیں عملاً برپا نہ ہو، نہ چوری اور لوٹ اور قتل کا کوئی ایک واقعہ بھی

نمودار ہو رہا ہو۔ اسی طرح اسلام کی نگاہ میں صلاح صرف اس حالت کا نام ہے کہ انسان پوری زندگی خدا کی ہدایت کے تحت بسر کر رہا ہو اور اس سے روکنے اور غیر اللہ کی غلامی پر مجبور کرنے والی کوئی قوت برسرِ عمل نہ ہو، چاہے اس حالت کے پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے معرکہ ہائے جنگ بار بار کیوں نہ برپا ہوں اور عوام کو اس سلسلہ میں کتنی ہی پریشانیوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس نظریۂ صلاح و فساد کے تحت بہت سے وہ لوگ جو اعلیٰ درجہ کے شرفا سمجھے جاتے ہیں درحقیقت اشرار میں شمار ہوں گے اور بہت سے امن پرور مفسدین قرار پائیں گے، دوسری طرف بہت سے وہ ہاتھ جو تلوار سونتے ہوں گے اور انسانی خون سے رنگین ہو رہے ہوں گے، امن پھیلانے والے ہاتھ سمجھے جائیں گے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر نظام حق کی اطاعت امن پروری ہے تو پھر ہر امن پرور کا فرض ہے کہ وہ نظام باطل کے خلاف بغاوت کرے۔ اس کا نام افساد فی الارض نہیں ہو سکتا۔

ایک ضروری تصحیح

ترجمان القرآن کے گذشتہ پرچے (جلد ۳۰ - عدد ۳) میں رسائل و مسائل کے باب میں جو سوالات و جوابات شائع ہوئے ہیں، ان میں سے حسب ذیل کو سہواً مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

۱۔ بہار کا خونی حادثہ اور مسلمان۔ ۲۔ خدا کی صفت خلق کی حقیقت

۳۔ شیطانی وساوس ۴۔ عصمت کی حفاظت کے لیے خودکشی

۵۔ موجودہ ہڑتالیں اور حق پسند مسلمان۔

ان عنوانات کے تحت سوالات کے جو جوابات درج ہیں وہ میرے قلم سے ہیں۔ رسالہ کی فہرست میں تصحیح کر لی جائے۔ (نعیم صدیقی)